ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to March2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-04

ماخذ تحقیقی مجلہ

OPEN ACCESS

ڈاکٹر زینت امان

پی ایچ ڈی اردو (اسکالر) نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

ادب، سیاست اور عوام: اردو ناول میں سیاسی استحصال کی بازگشت

Dr. Zeenat Aman *
Phd, Urdu, Scholar, NUML, Islamabad.
***Corresponding Author:**

Literature, Politics and the People: Echoes of Political Exploitation in Urdu Novels

This article presents the concept of political exploitation of the masses in the context of Urdu novels and analyzes the problems that the common man, especially the poor and weak classes, is facing at the political level. The article points out that literature, society and politics are closely related to each other and many novelists in Urdu literature have presented the political and social realities of their era in an artistic manner. The relationship of literature with politics is not limited to the mere narration of political events, but a writer gives more importance to the impact of these events on human life. Before and after the establishment of Pakistan, political consciousness has been prominent in Urdu literature and this tradition has been maintained in some form or another in every era. The article also makes it clear that influential classes, whether political or social, exploit the weak to maintain their superiority, which has become a serious social problem. In the present era, political and social exploitation has become so common that it has been considered a normal part of life and society does not react sensitively to it. This article clarifies the social role of literature by highlighting various forms of political exploitation through the Urdu novel.

Key Words: *Political exploitation, Public issues, Urdu novel, Social Injustice, Literature and Polics, Power and authority, State oppression, Social realism, Political consciousness, Class struggle.*

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to March2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-04

ادبی اصناف میں 'ناول' سماجی زندگی کی عکاسی کا سب سے جامع ذریعہ ہے۔ ایک حساس تخلیق کار اپنے عہد کے مذہبی، سیاسی اور معاشرتی تغیرات سے منہ نہیں موڑ سکتا، بلکہ وہ اپنے فن کے ذریعے ان پر بھرپور ردِ عمل دیتا ہے۔ اکیسویں صدی کی سائنسی ایجادات اور مشینی طرزِ زندگی نے انسانی شعور اور ادراک کے پیمانے بدل دیئے ہیں۔ آج کا ادب محض کہانی نہیں، بلکہ بدلتے ہوئے حالات میں انسانی وجود کو درپیش نئے سوالات کے جواب تلاش کرنے اور مستقبل کے چیلنجز سے آگاہ کرنے کا اہم فریضہ انجام دے رہا ہے۔ اس حوالے سے رضی عابدی کا موقف ہے کہ:

> "ادب شعور کو آگے بڑھاتا ہے آج اگر سیاست غلط راستے پر جا رہی ہے یا سائنس مہلک ہوتی جا رہی ہے اور سماجی ذمہ داریوں سے لاتعلقی کی وجہ سے ادیب جذبات کو صحیح ترتیب کرنے کے بجائے جذبات کو ہوا دیتا ہے اور انسانیت زبردست تذبذب سے گزر رہی ہے یہ سمجھنا ہو گا کہ وہ ادب کو ایک ذمہ داری سمجھ کر تخلیق کرے گا یا اسے صرف جمالیاتی حظ تک محدود رکھ کر جمالیات اور دانش کو علیٰحدہ خانوں میں رکھتے ہوئے محض تفریح کا ذریعہ بنائے گا۔ اسے فیصلہ کرنا ہو گا کہ وہ اربابِ دانش میں شمار ہونا چاہتا ہے یا اربابِ نشاط میں۔"(1)

اردو ناول ہمیشہ سے سیاسی شعور کی بیداری اور سماجی حقائق کی عکاسی کا مؤثر ذریعہ رہا ہے۔ گزشتہ تین صدیوں کے دوران ناول نگاروں نے محض قصہ گوئی کے بجائے حکومتی نظام کی خامیاں، سیاسی بے چینی، تحریکِ آزادی اور سماجی ناہمواریوں کو اپنا موضوع بنایا۔ ادب، سماج اور سیاست کا باہمی تعلق ہمیشہ سے اردو ناول کا بنیادی موضوع رہا ہے۔ اردو میں متعدد ایسے تخلیق کار ہیں جن کے ہاں سیاسی و سماجی تاریخ کے نقوش واضح ملتے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے وقت اور اس کے بعد کے حالات کو عبداللہ حسین نے جس دیانت داری سے قلمبند کیا، وہ ان کے گہرے مشاہدے کا ثبوت ہے۔ انہوں نے ایک عام فرد کی حیثیت سے مہاجرین کی آبادکاری، انتظامی بحران اور معاشی مسائل جیسے سنگین موضوعات کو اپنے ادب کا حصہ بنایا۔

پاکستان کی ابتدائی سیاسی تاریخ شدید افراتفری کا شکار رہی؛ پہلے وزیرِ اعظم کی شہادت سے لے کر مارشل لاء کے نفاذ تک، ان واقعات نے ملک کے جمہوری اور سماجی ڈھانچے کو بری طرح متاثر کیا۔ عبداللہ حسین کی تحریروں میں ان سیاسی تبدیلیوں کے نتیجے میں جنم لینے والے جرائم، صنعتی پھیلاؤ اور عوامی مشکلات کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to March2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-04

ان کا ادب ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتا ہے کہ سیاسی عدم استحکام کسی معاشرے کو کس طرح متاثر کرتا ہے۔ڈپٹی نذیر احمد اور پریم چند سے شروع ہونے والا یہ سفر عبداللہ حسین تک پہنچتے پہنچتے ایک ایسی دستاویزی صورت اختیار کر لیتا ہے جہاں تاریخ اور کہانی ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔برصغیر کی تہذیبی تبدیلیاں ان ناول نگاروں کے ہاں فنکارانہ رنگ میں محفوظ ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ ایک مورخ شاید مصلحتوں کا شکار ہو جائے، لیکن ایک سچا ادیب ہر قسم کے بیرونی دباؤ سے آزاد ہو کر اپنے عہد کی ایسی حقیقی تصویر کشی کرتا ہے جو ہر دور میں معتبر مانی جاتی ہے۔

ادب اور سیاست کا رشتہ ناگزیر ہے، خاص طور پر موجودہ دور میں ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔قومی سیاست اور انقلابی تحریکیں فطری طور پر تخلیقی شعور پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ایک حساس ادیب کے لیے محض سیاسی واقعات اہم نہیں ہوتے، بلکہ اس کی اصل توجہ ان سیاسی تغیرات کے نتیجے میں انسانی زندگی اور رویوں پر مرتب ہونے والے اثرات پر ہوتی ہے۔فرہنگ تلفظ کے مطابق سیاست عربی زبان کا لفظ ہے۔سیاست کے معنیٰ:

> "حکمت عملی، مصلحت اندیشی، حکمرانی، ملکی امور، حصول اقتدار اور مفادات کے تحفظ کے لیے جدوجہد کا نام ہے۔"(۲)

کوئی بھی تخلیق کار سیاسی شعور سے لاتعلق نہیں رہ سکتا، کیونکہ سیاسی استحکام ہی ادب کی ترقی کے لیے سازگار ماحول فراہم کرتا ہے۔اردو ادب کی تاریخ گواہ ہے کہ یہ ہمیشہ عصری سیاست کے زیرِ اثر پروان چڑھا ہے۔درحقیقت، سیاست ریاست کے نظم و نسق، حکومتی حکمتِ عملی اور عوامی خدمت کے نظام کو سمجھنے کا نام ہے۔قدیم یونانی فکر میں ریاست سے وابستہ ہر علم 'سیاست' کہلاتا تھا، مگر جدید دور میں اس کی تعریف بدل چکی ہے۔اب سیاست کا تعلق ریاست اور حکومت کو درپیش مخصوص سیاسی مسائل کے علمی و عملی تجزیے سے ہے۔اس حوالے سے فرہنگِ آصفیہ میں درج ہے کہ لفظ سیاست کے لغوی معنیٰ:

> "ملک کی حفاظت و نگرانی، حکومت اور سلطنت، ملک کا انتظام، بندوبست اور نظم و نسق کے ہیں۔"(۳)

ادب زندگی کی گوناگوں جہات کا عکاس ہے، جو انسانی وجود کے ہر پہلو سے متاثر ہوتا ہے۔ایک ادیب چونکہ اپنے ماحول سے کٹ کر نہیں رہ سکتا، اس لیے اس کی تحریروں میں سیاست کا در آنا ایک فطری امر ہے۔قدیم دور سے ہی سیاسی واقعات ادیبوں کو تخلیق پر مائل کرتے رہے ہیں، کیونکہ زندگی کی تمام تر قدروں کی ترجمانی کرنا

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to March2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-04

ماخذ تحقیقی مجلہ

ادب کا بنیادی فریضہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل، نظم، افسانہ اور ناول، ہر صنفِ ادب میں سیاسی شعور کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ادب اور سیاست کے اسی اٹوٹ رشتے نے وقت کے ساتھ ساتھ بڑی ادبی تحریکوں اور مخصوص نظریات کو جنم دیا ہے، جو کسی بھی عہد کے عصری شعور کی پہچان بنتے ہیں:

"ادب میں سیاست کی بھی اتنی ہی گنجائش ہے جتنی فلسفے یا مذہب کی مگر ادب کا طریقہ، سوال کرنے، سوالیہ نشان بنانے، مسئلے پیش کرنے سے زیادہ ہے جواب یا حل سے کم اور سیاست یا فلسفے یا مذہب کو حل کی فکر ہوتی ہے۔"(۴)

ادب اور سیاست کا رشتہ ایک ابدی حقیقت ہے جو قیامِ پاکستان سے قبل اور بعد، ہر عہد میں نمایاں رہا ہے۔ ایک تخلیق کار اپنے دور کی سماجی، معاشی اور سیاسی روح کو الفاظ کے روپ میں محفوظ کرتا ہے۔ چونکہ سیاست زندگی کے نظام پر حاوی ہے، اس لیے کوئی بھی ادیب اس سے مکمل فرار اختیار نہیں کر سکتا؛ در حقیقت سیاسی حالات ہی ادب کے لیے مستقبل کی راہیں متعین کرتے ہیں۔ ادب جہاں سیاسی آزادی کی تڑپ پیدا کرتا ہے، وہاں سیاسی رخ متعین کرنے میں بھی معاون ثابت ہوتا ہے۔ تاہم، ایک سچے ادیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ سیاست کو اپنے مخصوص ادبی اسلوب میں توڑھالے، مگر کسی خاص نظریے کا اسیر (قیدی) نہ بنے؛ کیونکہ نظریاتی قید فن کی موت کا سبب بن سکتی ہے۔ آج کے دور میں سیاست ہماری روزمرہ زندگی کا جزوِلاینفک بن چکی ہے، اس لیے عصری ادب میں سیاسی حقائق کی موجودگی محض اتفاقیہ نہیں بلکہ ایک شعوری کوشش کا نتیجہ ہے تاکہ فن پارہ اپنے عہد کی سچی عکاسی کر سکے۔

استحصال سے مراد وہ عمل ہے جس میں کوئی بااثر فرد، ادارہ یا طبقہ اپنے سے کمزور کے حقوق غضب کرتا ہے۔ یہ حق تلفی جب معاشرے میں جڑ پکڑ لیتی ہے تو سماجی ڈھانچہ بے انصافی، خلفشار اور طبقاتی کشمکش کی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔ علمی اردو لغت کی رو سے اس کی تعریف یوں ہے:

"استحصال عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں حاصل کرنا، حاصل کرنے کی خواہش رکھنا، چھین لینا، چھین لینے کا عمل یا کیفیت۔
استحصال بالجبر: زبردستی چھین لینا، زبردستی حاصل کرنا، جبراً چھین لینے کا عمل۔"(۵)

کارل مارکس وہ مفکر تھا جس نے تاریخ میں پہلی بار استحصال کے عمل کا سائنسی بنیادوں پر تجزیہ کیا۔ اس نے مزدور طبقے کو اس جبر سے آگاہ کیا جسے ماضی میں 'تقدیر کا لکھا' سمجھ کر قبول کر لیا جاتا تھا۔ مارکس کے نزدیک

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to March2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-04

ماخذ تحقیقی مجلہ

موجودہ نظام ہی تمام برائیوں کی جڑ ہے، کیونکہ سرمایہ داری کی بنیاد ہی محنت کش کی حق تلفی پر قائم ہے۔ اس نظام کا سب سے بڑاالمیہ یہ ہے کہ سرمایہ دار مزدور کی محنت کا ثمر اسے مکمل طور پر نہیں دیتا۔ مزدور اپنے ہاتھوں سے جو دنیا تعمیر کرتا ہے، وہی اس کے لیے پرائی ہو جاتی ہے۔ وہ بلند و بالا عمارتیں اور ہسپتال تو بناتا ہے، مگر خود چھت سے محروم رہتا ہے اور بیماری کی صورت میں مہنگے علاج کی سکت نہیں رکھتا۔ ایک طرف سرمایہ دار طبقہ مزدور کی دولت پر عیش و عشرت کرتا ہے، تو دوسری طرف محنت کش بنیادی ضروریات کے لیے بھی دوسروں کا دستِ نگر ہوتا ہے۔ یہ معاشی ناہمواری انسان کو اس حد تک نفسیاتی دباؤ میں مبتلا کر دیتی ہے کہ وہ زندگی کے ساتھ ساتھ موت کے اخراجات سے بھی خوفزدہ رہتا ہے، مبادا اس کی سفید پوشی کا بھرم کھل جائے۔ یہی وہ معاشی تضادات ہیں جن کی بنا پر سرمایہ داری کو استحصال کا منبع قرار دیا گیا ہے۔ اس موضوع پر پروفیسر نعیم قاسم اپنے مضمون "استحصال کی جڑ" میں رقم طراز ہیں:

> "سرمایہ دارانہ معیشت میں ہر طرح کی معاشی سرگرمی کی بنیاد استحصال اور محورِ منافع اور ذاتی مفاد ہوتا ہے۔"[۲]

معاشرتی سطح پر بااثر طبقہ، چاہے وہ خاندان میں ہو یا سماج میں اپنی برتری برقرار رکھنے کے لیے کمزور طبقات کے ساتھ توہین آمیز رویہ اپناتا ہے۔ اپنے ذاتی مفادات کی خاطر دوسروں کی مجبوریوں کا فائدہ اٹھانا استحصال کی بدترین شکل ہے، جو اب ایک پیچیدہ عالمی اور قومی مسئلہ بن چکا ہے۔ بدقسمتی سے معاشرے میں مذہبی، سیاسی، سماجی اور جنسی استحصال اس قدر عام ہو چکا ہے کہ لوگ اسے ایک غیر معمولی برائی کے بجائے معمول کا حصہ سمجھ کر نظر انداز کرنے لگے ہیں۔ یہ بے حسی اس مسئلے کی سنگینی کو مزید بڑھا رہی ہے، جس کے اثرات زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں ہیں۔ سیاسی استحصال اس وقت جنم لیتا ہے جب ملک کی قیادت عام آدمی کو بنیادی حقوق فراہم کرنے کے بجائے محض انتخابی وعدوں اور نعروں سے بہلاتی رہے۔ موروثی اور روایتی نظامِ سیاست اس استحصال کو مزید تقویت دیتا ہے، جہاں عوام کی حیثیت صرف ایک 'ووٹر' تک محدود کر دی جاتی ہے۔ اس طرزِ عمل سے مایوس ہو کر عوام نہ صرف نظام سے بیزار ہو جاتے ہیں بلکہ وہ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ گٹھ جوڑ کے رحم و کرم پر رہ جاتے ہیں۔ جب سیاست عوامی خدمت کے بجائے دولت کے سہارے ایک 'کاروبار' بن جائے، تو سیاسی نظام مفلوج ہو جاتا ہے اور عام آدمی موروثی سیاست کے بوجھ تلے دب کر رہ جاتا ہے۔ اس المناک صورتحال پر راؤ غلام مصطفیٰ رقم طراز ہیں:

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to March2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-04
ماخذ تحقیقی مجلہ

"اقوام متحدہ کے چارٹر آئین پاکستان میں یہ آرٹیکل موجود ہے کہ روٹی، کپڑا، مکان، تعلیم اور صحت کی سہولت عام فرد کو بہم پہنچانا ریاست کی ذمہ داری ہے لیکن بنیادی انسانی حقوق کا یہ آرٹیکل آج تک معطل ہے۔"(۷)

موجودہ سیاسی نظام میں عوام کو فیصلہ سازی کے عمل سے مکمل طور پر بے دخل کر دیا گیا ہے۔ حکومتی پالیسیاں عوامی مفادات کے بجائے اشرافیہ کی مراعات کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے مرتب کی جاتی ہیں، جس کی واضح جھلک ہر سال بجٹ میں نظر آتی ہے۔ پاکستان کا سیاسی ڈھانچہ موروثیت کی گرفت میں ہے، جہاں چند جاگیر دار اور سرمایہ دار خاندان اقتدار پر قابض ہو کر عام آدمی کا استحصال کر رہے ہیں۔ اس موروثی تسلط کے نتیجے میں جہاں سیاستدان اور بااثر طبقہ مزید صاحبِ ثروت ہو رہا ہے، وہیں عام شہری بنیادی حقوق سے محرومی اور بڑھتی ہوئی غربت کی دلدل میں دھنستا جا رہا ہے۔ اس صورتحال کی عکاسی کرتے ہوئے رئیس انصاری لکھتے ہیں کہ: "ایسا لگتا ہے کہ سیاست دان شہنشاہ وقت اور عوام بچاری ان کی رعایا ہے۔"(۸)

مفاد پرست سیاستدان انتخابی مہم کے دوران خوش کن نعروں اور جھوٹے وعدوں کے ذریعے عوام کو پانچ سال کے لیے دوبارہ سیاسی غلام بنا لیتے ہیں۔ یہ اشرافیہ جان بوجھ کر عوام میں سیاسی شعور بیدار نہیں ہونے دیتی، کیونکہ بیدار مغز عوام ان کی موروثی بادشاہت کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غریب کے لیے تعلیم کے دروازے بند رکھے جاتے ہیں جبکہ حکمران طبقے کی نئی نسل بیرونِ ملک سے تربیت پا کر دوبارہ اسی محکوم قوم پر مسلط ہو جاتی ہے۔ صنعت کار، جاگیر دار اور سیاستدان کا گٹھ جوڑ اس خوف میں مبتلا رہتا ہے کہ اگر عوام معاشی طور پر مستحکم اور تعلیم یافتہ ہو گئے تو ان کی نسل در نسل غلامی کا بت ٹوٹ جائے گا۔ نتیجتاً قومی خزانہ عوامی فلاح کے بجائے ذاتی مفادات پر خرچ ہوتا ہے اور قانون سازی بھی صرف بااثر طبقات کے تحفظ کے لیے کی جاتی ہے۔ اس سیاسی منافقت کی عکاسی کرتے ہوئے رئیس انصاری لکھتے ہیں:

"عوام کی فلاح اور بہبود کے لیے قانون سازی تو دور کی بات ایسی کسی قرار داد کی باز گشت بھی ایوان میں نہیں سنی جائے اور سیاست دان کو بچانے کے لیے ایک دن میں نیا قانون بنا کر منظور کروالیا جائے۔"(۹)

عوامی استحصال کی ایک صورت سیاسی لاعلمی بھی ہے، جہاں عام شہری اپنے منتخب نمائندوں کے اختیارات اور فرائض کے فرق سے ناواقف رہتا ہے۔ منتخب نمائندوں کی اپنے حلقوں سے مسلسل غیر حاضری اور

ISSN(P): 2709-9636 | ISSN(O): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to March2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-04

عوامی لاتعلقی اس خلیج کو مزید بڑھا دیتی ہے۔ ملکی وقار کی بحالی کے لیے ناگزیر ہے کہ عوام اب خود بیدار ہوں اور سیاسی حالات سے مکمل آگاہی حاصل کریں۔ جب تک عوام اپنے حقوق اور ووٹ کی اہمیت کو نہیں پہچانیں گے، تب تک انسانی حقوق کی پامالی کرنے والے عناصر ان پر مسلط ہوتے رہیں گے۔ مزدور اور محنت کش طبقے کی نجات اسی میں ہے کہ وہ موروثی اور جاگیر دارانہ سیاست کے چنگل سے نکل کر شعوری طور پر اپنے نمائندوں کا انتخاب کریں۔ سیاسی آگاہی اور بہتر قوتِ فیصلہ ہی وہ اوزار ہیں جن کے ذریعے استحصال کا یہ طویل سلسلہ ختم کیا جا سکتا ہے۔ بصورتِ دیگر، جاگیر داری نظام اسی طرح انسانیت کی تذلیل اور حقوق کی پامالی کرتا رہے گا۔

ہماری زندگی براہِ راست یا بالواسطہ طور پر سیاست کے زیرِ اثر ہے اور اس کے بڑھتے ہوئے نفوذ سے بچنا اب ممکن نہیں رہا۔ ہر ملک کا سیاسی نظام اور وہاں کے مخصوص حالات دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، جو عوامی زندگی پر منفرد انداز میں اثر انداز ہوتے ہیں۔ ایک حساس ادیب چونکہ اپنی عصری زندگی سے جڑا ہوتا ہے، اس لیے اگر اس کے عہد کے بنیادی مسائل سیاسی نوعیت کے ہوں تو ان کی جھلک ادب میں آنا لازمی ہے۔ کوئی بھی تخلیق کار اپنے زمانے کی سیاسی تبدیلیوں اور معاشی محرکات سے لاتعلق نہیں رہ سکتا، یہی وجہ ہے کہ 'زندہ ادب' ہمیشہ اپنے عہد کے سیاسی و سماجی شعور کا عکاس ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سعادت سعید رقم طراز ہیں: "حقیقی ادب تو شعور کی درست سیاسی، ثقافتی اور نظریاتی جہت ہی کی بدولت وجود میں آتا ہے۔"(۱۰)

ادب کا قومی اور انقلابی سیاست سے متاثر ہونا ایک قدرتی امر ہے، تاہم ادب کو کسی مخصوص سیاسی گروہ کا آلہ کار نہیں بننا چاہیے۔ سیاست زندگی کے تمام شعبوں پر اثر انداز ہوتی ہے، اسی لیے ادب اپنے گردو پیش کے سیاسی و سماجی تغیرات کا عمیق مطالعہ پیش کرتا ہے۔ ہماری ثقافتی تاریخ میں پنچائیت جیسا روایتی نظام باہمی محبت اور سماجی جڑت کا ذریعہ تھا، جہاں مقامی سطح پر مسائل حل کر لیے جاتے تھے۔ مگر جدید سیاست نے اس روایتی بھائی چارے کی جگہ لے لی ہے، جہاں اخلاص کے بجائے محض کھوکھلے وعدے اور باہمی چپقلش نمایاں ہے۔ آج کے دور میں عوامی فلاح کے بجائے سیاسی مفادات کو ترجیح دی جاتی ہے اور عوامی مسائل صرف انتخابی مہم تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔

موضوعاتی مماثلت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو نثار عزیز بٹ کا ناول کاروانِ وجود سیاسی استحصال کی ایک گہری اور تلخ تصویر پیش کرتا ہے۔ ناول میں سارہ کا کردار ایک تعلیم یافتہ، باشعور اور اصول پسند خاتون کے طور پر سامنے آتا ہے۔ جو ابتدا میں سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لیتی ہے، مگر عملی طور پر جب وہ انتخابی عمل کا حصہ بنتی ہے تو اسے نظام کی اصل صورت حال کا براہ راست مشاہدہ ہوتا ہے۔ بطور پریزائیڈنگ افسر سارہ کا یہ تجربہ واضح کرتا ہے

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to March2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-04

کہ ہمارے ہاں جمہوریت صرف ایک نام ہے، جبکہ اصل طاقت اداروں اور بااثر افراد کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ قانون اور ضابطے کمزور پڑ جاتے ہیں اور ایمانداری جرم بن جاتی ہے۔ سارہ کا سخت نگرانی کرنا، ووٹوں کی جانچ پڑتال اور بوگس ووٹوں کے خلاف آواز اٹھانا اس بات کی علامت ہے کہ ایک فرد اگر نظام کو شفاف بنانا چاہے تو پورا ریاستی ڈھانچہ اس کے خلاف کھڑا ہو جاتا ہے۔ پولیس اور اعلیٰ افسران کا سارہ کو ڈانٹنا اس حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے کہ دھاندلی ایک منظم عمل ہے، جس میں ادارے خود شریک ہوتے ہیں یا کم از کم خاموش تماشائی بنے رہتے ہیں۔ دس سالہ بچیوں کا ووٹ ڈالنا سیاسی استحصال کی انتہا کو ظاہر کرتا ہے، جہاں عوام کی رائے کو پامال کر کے اقتدار پر قبضہ کیا جاتا ہے۔ مصنف اس واقعے کے ذریعے یہ پیغام دیتا ہے کہ سیاست دان عوام کے نمائندے نہیں بلکہ اقتدار کے بھوکے حکمران بن چکے ہیں، جو جمہوریت کو محض ایک ڈھونگ کے طور پر استعمال کرتے ہیں:

> "تب اس نے دیکھا کہ عیسوی کیلنڈر کے مطابق یہ حضرت مسیح کی پیدائش کے بعد انیس سو تریسٹھواں سال ہے۔ تقسیم ہند اور آزادی کو سترہ سال ہو چکے ہیں۔ ملک پر صدر ایوب کی حکومت ہے اور راوی بہت سے لوگوں کے لئے چین لکھتا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں سارہ نے ایک مرتبہ ملک کی سیاست سے روگردانی اختیار کی تو ان سترہ سالوں میں اخبار تک نہ اٹھا کر دیکھا۔ حکومتیں بنیں اور ٹوٹیں۔ وزیر آئے اور گئے۔ ۱۹۵۳ء میں انتخابات ہوئے تو کالج میں لیکچرار ہونے کی وجہ سے اسے پولنگ سٹیشن پر پریذائیڈنگ افسر مقرر کیا گیا۔"(۱۱)

یوں ناول میں الیکشن کا یہ منظر ہمارے سیاسی نظام کی کھوکھلی بنیادوں، ادارہ جاتی ناانصافی اور عوام کے استحصال کو بے نقاب کرتا ہے۔ سارہ کا خاموش ہو کر ایک طرف بیٹھ جانا اس بات کی علامت ہے کہ سچ بولنے والوں کو آخر کار خاموش کر دیا جاتا ہے اور یوں سیاسی استحصال ایک معمول بن کر معاشرے میں جڑ پکڑ لیتا ہے۔

اسی تسلسل میں حسن منظر کا ناول دھنی بخش کے بیٹے سیاسی استحصال اور طاقت کے غلط استعمال کی ایک نہایت واضح اور حقیقت پسندانہ تصویر پیش کرتا ہے۔ دھنی بخش کے گھرانے کا اثر و رسوخ بظاہر گاؤں کی فلاح کے لیے استعمال ہوتا نظر آتا ہے، مگر در حقیقت یہ اثر طاقت کے مظاہرے اور ذاتی برتری قائم رکھنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ مسجد کی تعمیر جیسے کام سماجی خدمت کے پردے میں کیے جاتے ہیں، لیکن ان کے پس منظر میں اقتدار اور حیثیت کو مضبوط کرنے کی خواہش کارفرما دکھائی دیتی ہے۔ احمد بخش کا سڑک پر پیش آنے والا واقعہ ہمارے سیاسی نظام میں پروٹوکول کی اس اندھی پیروی کو بے نقاب کرتا ہے جس میں عام انسان کی جان، عزت اور ضرورت کوئی معنی نہیں

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to March2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-04

رکھتی۔ ایک مریض کو ہسپتال لے جانے کے باوجود راستہ بند رہنا اس بات کی علامت ہے کہ ریاستی طاقت چند مخصوص افراد کے لیے مختص ہے، جبکہ عوام محض تماشائی بنا دیئے جاتے ہیں۔ حکمرانوں کی گاڑیوں کا قافلہ اور عوام کی بے بسی اس طبقاتی فرق کو نمایاں کرتا ہے جو سیاست نے جنم دیا ہے:

> "پہلے دو دو کی تعداد میں بہت سے موٹر سائیکل سوار گزرے، پھر ایک لمبا خلا بنا اس کے بعد ایک آر مرڈ کار گزری، اس کے پیچھے کتنی جیپیں، پھر ایک ایمبولیس، پھر ایک ہی رنگ اور ایک ہی ماڈل کی چار کاریں گزریں۔ سب پر جھنڈا لہرا رہا تھا ان کے پیچھے جو کار تھی اس پر لکھا تھا موبائل ہسپتال۔ دو رویہ کھڑے ہوئے لوگوں کی باتیں احمد بخش کو سنائی دے رہی تھیں۔ اب ان کے چہروں پر خوشی تھی۔ کسی نے کہا وزیر اعظم پہلی کار میں تھے، کسی نے کہا تیسری، کسی نے چوتھی۔"(۱۲)

گاؤں واپس آ کر احمد بخش کا مشاہدہ اس سیاسی استحصال کی ایک اور صورت سامنے لاتا ہے۔ عوام کی اکثریت بنیادی سہولتوں سے محروم ہونے کے باوجود مطمئن دکھائی دیتی ہے، کیونکہ انہیں مسائل پر سوال اٹھانے کی عادت ہی نہیں دی گئی۔ سیاست دان اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور بڑے بڑے خواب دکھا کر عوام کو بہلاتے رہتے ہیں، حالانکہ حقیقت میں ان کے وعدے عملی حیثیت نہیں رکھتے۔ قومی اسمبلی کا امیدوار بننے والے بزرگ کے دعوے اس سیاسی منافقت کی مثال ہیں، جہاں ترقی کے نعرے محض اقتدار حاصل کرنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ سڑک کو ذاتی نام سے منسوب کرنا یا مخالفین کو نیچا دکھانے کے منصوبے بنانا اس بات کا ثبوت ہے کہ سیاست عوامی خدمت کے بجائے ذاتی انا اور انتقام کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ مصنف یہ واضح کرتا ہے کہ اگر عوام کی فوری اور بنیادی ضروریات پوری نہ ہوں تو وہ خود بخود سوال اٹھانا شروع کر دیں گے، مگر سیاسی طبقہ جان بوجھ کر انہیں غفلت میں رکھتا ہے تاکہ استحصال کا یہ نظام قائم رہ سکے۔ یوں ناول مجموعی طور پر ہمارے سماج میں رائج سیاسی استحصال، طاقت کی نمائش اور عوامی شعور کی کمی کو نہایت مؤثر انداز میں آشکار کرتا ہے۔

صرف یہی نہیں بلکہ امجد جاوید کے ناول روشن اندھیرے میں کنول جیت کا کردار اگرچہ عارضی ہے، مگر وہ سیاسی استحصال کی ایک نہایت دردناک اور موثر علامت بن کر سامنے آتا ہے۔ اس کی کہانی ذاتی المیے سے شروع ہو کر اجتماعی سیاست کے ظلم تک پھیل جاتی ہے۔ خالصتان تحریک جو بظاہر ایک مخصوص طبقے کی سیاسی اور انقلابی آواز تھی۔ در حقیقت ایسے افراد کے لیے موت اور تباہی کا سبب بنی جو اس سے وابستہ سمجھے گئے۔ کنول جیت کے بھائی کا

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to March2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-04

قتل اسی سیاسی وابستگی کی سزا کے طور پر سامنے آتا ہے۔ جہاں اختلاف رائے یا سیاسی جھکاؤ کو جینے کا حق چھین لینے کا جواز بنالیا جاتا ہے۔ یہ واقعہ اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ جب سیاست شدت پسندی کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو اس کی زد میں صرف کارکن ہی نہیں بلکہ ان کے بے گناہ اہل خانہ بھی آجاتے ہیں، کنول جیت کے پورے خاندان کا قتل اس بات کا ثبوت ہے کہ سیاسی تحریکیں اکثر عام انسانوں کو ڈھال بنا کر اپنے مقاصد حاصل کرتی ہیں اور بعد میں ان کی قربانی کو محض ایک عدد یا خبر سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے:

> "ان دنوں میں کنول جیت کالج میں پڑھتی تھی۔ وہ جوانی کی پُر بہار وادی میں قدم رکھ چکی تھی۔ اس کے ارد گرد خوشیاں تھیں، زندگی تھی اور قہقہے تھے۔ وقت بڑے سکون میں گزر رہا تھا۔ وہ چار بہن بھائی تھے۔ ایک اس سے بڑا، ایک چھوٹی بہن اور پھر بھائی۔ اس کا بڑا بھائی امر تسر میں جاب کرتا تھا اور خالصتان تحریک کا زبردست حامی تھا، یہی جرم تھا جو اس کی زندگی کے خاتمے کا باعث بنا۔"(۱۳)

کنول جیت کے دل میں جنم لینے والا انتقام کا جذبہ بھی سیاسی استحصال کا نتیجہ ہے۔ ایک خوشحال اور پر سکون زندگی گزارنے والی طالبہ کو حالات نے اس نہج پر لا کھڑا کیا جہاں اس کی زندگی کا مقصد نفرت اور بدلے کے گرد گھومنے لگتا ہے۔ دہلی میں خالصتان تحریک کے حامیوں کی جانب سے اس کی سرپرستی اس بات کو واضح کرتی ہے کہ سیاسی گروہ مظلومیت کے جذبات کو استعمال کر کے افراد کو اپنے نظریے کے قریب لاتے ہیں اور یوں ذاتی دکھ اجتماعی سیاست کا ایندھن بن جاتا ہے۔ مصنف اس کردار کے ذریعے یہ پیغام دیتا ہے کہ سیاسی تحریکیں جب انسانیت سے خالی ہو جائیں تو وہ انصاف کے بجائے ظلم کو جنم دیتی ہیں۔ کنول جیت کی کہانی دراصل اس سیاسی نظام پر سوال ہے جو نظریات کی آڑ میں بے گناہوں کی جان لیتا ہے اور نفرت، انتقام اور عدم تحفظ کو فروغ دیتا ہے۔ یوں ناول میں کنول جیت سیاسی استحصال کی ایک خاموش مگر گہری گواہی بن کر ابھرتی ہے۔

آغا گل کے ناول دشتِ وفا میں نجیب کا کردار سیاسی استحصال کی ایک جیتی جاگتی مثال ہے۔ وہ ایک ایسا نوجوان ہے جو اپنے خطے، اپنے لوگوں اور اپنے نظریے سے سچی وابستگی رکھتا ہے۔ پہاڑوں میں جان ہتھیلی پر رکھ کر لڑنا اس کی ذاتی خواہش نہیں بلکہ ایک مجبور قوم کا مقدر ہے، جو ریاستی اور سردارانہ سیاست کے بیچ پس رہی ہے۔ بلوچستان میں خونریزی، ناانصافی اور محرومی کے ماحول میں جب نجیب کو اسلام آباد کورس پر بھیجنے کا حکم دیا جاتا ہے تو یہ دراصل

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to March2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-04
ماخذ تحقیقی مجلہ

جدوجہد کو کمزور کرنے کی ایک سیاسی چال محسوس ہوتی ہے۔ اس کا دل اپنے ساتھیوں اور تحریک کے ساتھ رہنا چاہتا ہے، مگر تنظیمی دباؤ اور ترقی کے خواب کے نام پر اسے مرکز کی طرف دھکیل دیا جاتا ہے:

"تم یہ کورس کر لوگے تو ترقی بھی جلدی مل جائے گی۔ چیئر مین بلوچستان اسٹوڈینٹس آرگنائیزیشن کے اور فیلڈ کمانڈر خیر جان نے پیغام بھجوایا۔ "کورس پر ضرور جاؤ۔ ہمیں اپنے افسروں کی ضرورت ہے۔ تم جیسے نالائق ہی سہی۔"(۱۴)

یہاں سیاسی استحصال کی اصل شکل سامنے آتی ہے کہ کس طرح ریاست اور طاقتور طبقہ ایسے باصلاحیت اور باشعور نوجوانوں کو میدانِ مزاحمت سے ہٹا کر نظام کا حصہ بنانے کی کوشش کرتا ہے، تاکہ اصل جدوجہد دم توڑ دے۔ چیئرمین اور فیلڈ کمانڈر کا پیغام دراصل ایک تلخ طنز ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ نظام کو اہل اور باخبر لوگوں کی نہیں بلکہ تابع دار افسروں کی ضرورت ہے، چاہے وہ نالائق ہی کیوں نہ ہوں۔ نجیب کے خیالات کے ذریعے ناول میں بلوچستان کے سردارانہ اور نوابی نظام پر شدید تنقید کی گئی ہے۔ یہ نظام سیاسی طاقت کو چند خاندانوں تک محدود رکھتا ہے اور عام آدمی کو تعلیم، شعور اور ترقی سے محروم رکھتا ہے۔ استادوں کو صوبے سے نکال دینا محض ایک انتظامی فیصلہ نہیں بلکہ ایک منظم سیاسی استحصال ہے، جس کا مقصد عوام کو جہالت میں رکھ کر سرداروں کی حکمرانی کو دوام بخشنا ہے۔ جبکہ دنیا میں تعلیم کو ترقی کی بنیاد سمجھا جاتا ہے، بلوچستان میں تعلیم کو خطرہ سمجھ کر دبایا گیا۔ نجیب یہ حقیقت جانتا ہے کہ اسمبلیوں میں ہمیشہ وہی سردار اور نواب واپس آئیں گے جن کے بچے بہترین تعلیمی اداروں میں پڑھ رہے ہیں، جبکہ عام بلوچ کے لیے تعلیم صرف ایک خواب بن کر رہ جاتی ہے۔ یہی عدم مساوات سیاسی استحصال کی بنیاد ہے، جہاں قانون، سیاست اور تعلیم سب طاقتور طبقے کے مفادات کے تابع ہیں:

"ہر شام جب ڈوبتے ہوئے سورج کے وقت پوری کائنات پہ خدا کا جلال طاری ہوتا ہے۔ وہ اکیلے میں بیٹھ کر حالات کے بارے میں سوچا کرتا، اسے یقین تھا انقلابی کچھ حاصل نہیں کر سکیں گے، اسمبلی میں دوبارہ سردار ہی آئیں گے یا پھر نواب۔ تمام سرداروں اور نوابوں کے بیٹے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھ رہے تھے۔ عیش و آرام کی زندگی گزار رہے تھے۔"(۱۵)

مختصر یہ کہ ناول میں نجیب کا کردار اس سیاسی استحصال کو بے نقاب کرتا ہے جس کے تحت ایک پورے خطے کو شعوری طور پر پسماندہ رکھا گیا۔ تعلیم پر پابندی، استادوں کی جلاوطنی، اور باصلاحیت نوجوانوں کو اصل جدوجہد

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to March2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-04
ماخذ تحقیقی مجلہ

سے دور کرنا، یہ سب اس بات کا ثبوت ہیں کہ سردارانہ نظام عوام کو بااختیار بنانے کے بجائے انہیں محکوم رکھنے پر یقین رکھتا ہے۔ ناول نگار نے نجیب کے ذریعے یہ پیغام دیا ہے کہ جب تک سیاسی اور تعلیمی استحصال ختم نہیں ہو گا، تب تک حقیقی آزادی اور ترقی ممکن نہیں۔

محمد حفیظ خان کے ناول ادھ ادھورے لوگ میں سیاسی استحصال کی ایک واضح تصویر نظر آتی ہے۔ فیاض کے کردار اور ایوب خان کی حکومت کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ کس طرح طاقت کے حامل افراد عوامی جذبات اور امیدوں کو اپنے ذاتی مفادات کے لیے استحصال کر لیتے ہیں۔ ایوب خان نے ابتدا میں اپنے اقتدار کو نظریاتی نعرے اور عوامی مقبولیت کے ذریعے مضبوط کیا، جس کی بنیاد پر لوگ ان کو اپنا رہنما اور ترجمان سمجھ بیٹھے ہیں۔ عوام کی عقیدت اور توقعات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایوب خان نے اپنی کرسی کی حفاظت کو ترجیح دی اور وہ حقیقی عوامی مسائل، چھوٹی ثقافتوں کی شناخت اور معاشرتی انصاف کو پس پشت ڈال گئے:

> "ایوب خان کے خلاف نفرت کا کوئی ایک دہانہ یا گزر گاہ نہیں تھی۔ لوگ جس چیز سے نالاں ہوتے اُس کا رُخ نفرت کی علامت کے طور پر ایوب خان کی طرف موڑ دیتے۔ چینی چار آنے مہنگی ہوئی تو برا ایوب خان اور آٹا دو آنے مہنگا ہوا تو نفرین ایوب خان پر۔ ۱۹۶۷ء کے آتے آتے شہر شہر بستی بستی اچھے بھلے جلسے جلوس شروع ہو گئے۔ ان کی شروعات سکول اور کالجوں سے ہوئی، پھر یہ نفرت گلی گلی محلے محلے پھیلتی چلی گئی۔"(۱۶)

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سیاسی استحصال ہمیشہ ظاہری محبوبیت کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ عوام کسی نظریے یا نعرے سے متاثر ہو کر اپنے لیڈر کے ساتھ جذباتی وابستگی قائم کرتے ہیں، مگر جب وہ لیڈر اپنے اقتدار کے لیے عوامی مفادات کو قربان کر دیتا ہے۔ تو وہی عقیدت نفرت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ مثال کے طور پر آٹا یا چینی، مہنگی ہونے پر عوام اپنا غصہ براہ راست ایوب خان پر نکالتے ہیں، حالانکہ اصل محرک سیاسی نظام اور اقتصادی فیصلے ہیں۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عوام کی جذباتی وابستگی اور نظریاتی فریب کے ذریعے انہیں قابو میں رکھا جا سکتا ہے، جبکہ حقیقی طاقت اور فیصلے چند افراد کے ہاتھ میں مرکوز رہتے ہیں۔ فیاض کا جیل جانا، سیاست سے الگ تھلگ ہو جانا اور پھر بھی دل میں ایوب خاں کے خلاف انتقام کی خواہش رکھنا، سیاسی استحصال کے انسانی اور اخلاقی پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ دکھاتا ہے کہ سیاسی استحصال صرف ادارہ جاتی یا معاشی نہیں ہوتا بلکہ اس کا اثر افراد کی نفسیات، جذبات اور

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to March2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-04

سماجی تعلقات پر بھی پڑتا ہے۔ لوگوں کی امیدوں، عقیدت اور محبت کا استحصال کر کے طاقت کے حامل اپنے مفادات حاصل کرتے ہیں اور جب یہ حقیقت سامنے آتی ہے تو عوام میں نفرت اور بے اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے ۔

کوہِ گراں میں بھی خالد فتح محمد نے سیاسی بیانیے کے کچھ زاویوں کو دکھانے کی عمدہ کوشش کی ہے۔ ضیاء الحق کے دور حکومت میں مولویوں کی اندھی لاقانونیت، دھاندلی اور غیر اخلاقی کاروائی "کوہِ گراں" کے بیانیے میں سموئی ہوئی ہے۔ چودھری حلیم کا کردار سیاسی استحصال کی ایک نرم مگر گہری صورت کو نمایاں کرتا ہے۔ بظاہر وہ گاؤں کی بہتری، صفائی اور تعمیر نو کے لیے عملی منصوبہ بندی کرتا ہے، مگر تمام فیصلوں کا اختیار ایک ہی بااثر خاندان کے پاس ہونا عوامی شمولیت کی کمی کو ظاہر کرتا ہے۔ گاؤں کے مسائل کو ذاتی اثر و رسوخ کے ذریعے حل کرنا دراصل ریاستی نظام کی غیر موجودگی اور عوام کو فیصلہ سازی سے دور رکھنے کی علامت ہے۔ اگرچہ کمیٹی بنانے اور انتخاب کا تصور جمہوری دکھائی دیتا ہے، لیکن اصل طاقت پھر بھی چودھری حلیم اور اس کے خاندان کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ فیصلوں میں جانبداری، ذاتی مفادات اور راستوں کی بندش جیسے اقدامات اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ ترقی کے نام پر عوام کو نئے مسائل میں الجھا دیا جاتا ہے:

> "گاؤں کی ایک کونسل ہو گی۔ پہلے سال اس کونسل کو میں نامزد کروں گا۔" حلیم، حفیظ کے ردعمل کے لیے رُکا پھر ہر سال یہ کونسل منتخب ہوا کرے گی۔ اس کونسل میں ذات پات کا کوئی دخل نہیں ہو گا ہمارے سیاسی نظام کی تباہی کی وجہ ہی ذات پات کا نظام تھی۔ برادریاں اور قبیلے ہر نظام سے زیادہ طاقت ہو گئے تھے۔ میرا خاندان بھی اس کی طاقت کے ستونوں میں سے ایک تھا۔ اب انھیں کمزور کرنے کا آغاز میں کروں گا۔"(۱۷)

مصنف یہ دکھاتا ہے کہ سیاسی نظام میں فلاحی کام بھی طاقت کے اظہار کا ذریعہ بن جاتے ہیں، جہاں عوام کو سہولت دینے کے ساتھ ساتھ ان پر بالادستی قائم رکھی جاتی ہے۔ یوں ناول میں چودھری حلیم کا کردار اس حقیقت کی عکاسی کرتا ہے کہ جب اختیار چند ہاتھوں میں مرتکز ہو جائے تو جمہوریت محض ایک ظاہری ڈھانچہ رہ جاتی ہے اور سیاسی استحصال خاموشی سے معاشرے میں جڑ پکڑ لیتا ہے۔

مذکورہ بالا تمام ناولوں کا تجزیاتی مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ اردو فکشن نے محض کہانیاں بیان نہیں کیں بلکہ اپنے عہد کے سیاسی و سماجی استحصال کی ایک مستند تاریخ مرتب کی ہے۔ خالد فتح محمد اور علی اکبر ناطق کے ہاں جہاں اقتدار کی تبدیلی اور نظریاتی جبر کے انسانی زندگی پر اثرات نمایاں ہیں، وہیں نثار عزیز بٹ اور حسن منظر جیسے

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to March2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-04
ماخذ تحقیقی مجلہ

تخلیق کاروں نے انتخابی ڈھونگ، بیوروکریسی کی بے حسی اور جاگیر دارانہ نظام کے زہریلے ثمرات کو بے نقاب کیا ہے۔ یہ تمام فن پارے اس حقیقت کی نشان دہی کرتے ہیں کہ سیاست جب عوامی خدمت کے بجائے محض ذاتی مفاد اور نعرہ بازی کا آلہ کار بنتی ہے، تو معاشرے کا ہر طبقہ، خصوصاً خواتین اور محنت کش، اس کی لپیٹ میں آتے ہیں۔ امجد جاوید، آغا گل اور محمد حفیظ خان کے بیانیے اس تلخ سچائی کو آشکار کرتے ہیں کہ سیاسی تحریکیں اور آمریتیں اکثر عوام کے جذباتی استحصال اور جھوٹے نعروں کی بنیاد پر استوار ہوتی ہیں۔ ان ناولوں کا بنیادی پیغام یہ ہے کہ جب تک عوام میں شعوری بیداری پیدا نہیں ہو گی اور ادارے فردِ واحد یا مخصوص خاندانوں کی لونڈی بنے رہیں گے، تب تک عام شہری بنیادی حقوق سے محروم اور 'رعایا' کی سطح پر ہی رہے گا۔ خلاصہ یہ کہ اردو ناول نگاروں نے سیاسی استحصال کو صرف ایک موضوع کے طور پر نہیں برتا، بلکہ اسے ایک ایسی سماجی برائی کے طور پر پیش کیا ہے جس کا خاتمہ صرف اور صرف عوامی شعور، سیاسی آگاہی اور حقیقی جمہوری اقدار کی بحالی میں پوشیدہ ہے۔

حوالہ جات

۱۔ رضی عابدی، "ادب اور وابستگی"؛ مشمولہ: ادب، زندگی اور سیاست (نثری مباحث)، مرتبہ محمد خاور نوازش، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۲۲۷

۲۔ فرہنگِ تلفظ، شان الحق حقی، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، پاکستان، طبع سوم، ۲۰۰۸ء، ص ۶۴۸

۳۔ سید احمد دہلوی، مولوی، فرہنگِ آصفیہ، مرتبہ، جلد سوم، اردو سائنس بورڈ، ۱۹۸۶ء، ص ۱۴

۴۔ راجندر سنگھ بیدی، ادب اور سیاست، مشمولہ: ادب، زندگی اور سیاست، مرتبہ محمد خاور نوازش، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۴۰۰

۵۔ علمی اُردو لغت (جامع)، مرتب وارث سرہندی، ایم اے، علمی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۸۳ء

۶۔ نعیم قاسم، پروفیسر، "استحصال کی جڑ"، روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۵ فروری، ۲۰۱۶ء

۷۔ راؤ غلام مصطفیٰ، موروثی سیاسی نظام اور جمہوریت، (کالم) مطبوعہ روزنامہ نئی بات، ۲۵ نومبر ۲۰۱۹ء

۸۔ رئیس انصاری، سیاست کی سیاست، www.urdu.geo.tv، ۳ فروری ۲۰۲۶ء، ۱۱:۵۰ Am

۹۔ ایضاً

۱۰۔ سعادت سعید، ڈاکٹر، ادب اور نفی (مضامین) دستاویزِ مطبوعات، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۹

۱۱۔ نثار عزیز بٹ، کاروانِ وجود، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۶۷۹

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to March2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-04

ماخذ تحقیقی مجلہ

۱۲۔ حسن منظر، دھنی بخش کے بیٹے، شہرزاد پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۸ء، ص ۱۷۳

۱۳۔ امجد جاوید، روشن اندھیرے، علم و فرفان پبلشرز، اردو بازار لاہور، جولائی ۲۰۱۰ء، ص ۳۱۵

۱۴۔ آغا گل، دشتِ وفا، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۱۲۳

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۲۶

۱۶۔ محمد حفیظ خان، ادھ ادھورے لوگ، ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ملتان، نومبر ۲۰۱۸ء، ص ۲۰۸۔۲۰۹

۱۷۔ خالد فتح محمد، کوہِ گراں، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۱۵۹